سب کے لیے قابلِ قبول شریعت[1]

جناب محمد تقی عثمانی صاحب

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کے روزنامہ "جنگ" میں صفحہ اوّل پر جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی ہے:

"مدینہ منورہ (نمائندہ خصوصی) وزیراعظم محمد خان جونیجو نے مدینہ منورہ میں پاکستانیوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں وہی شریعت نافذ ہوگی جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔"[2]

کاش کہ ہمارے ملک کے انتظامی سربراہ اس کے بجائے یہ فرماتے کہ "ملک میں وہ شریعت نافذ ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے قابلِ قبول ہو" لیکن درحقیقت

---

[1] تازہ البلاغ کا اداریہ (شکریہ البلاغ) نقل کیا جا رہا ہے۔ ہم نے عنوان بھی بدل دیا ہے، اور کچھ حواشی بھی لکھے ہیں۔ امید ہے کہ ادارۂ البلاغ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ (ف۔ ص)

[2] اس سے تو یہی مفہوم نکلتا ہے کہ کوئی چیز اکبر کے "دینِ الٰہی" کے طرز کی ایجاد کی جانے والی ہے۔ مگر خود اس دینِ الٰہی پر بھی تو سب متفق نہیں ہو سکتے، بلکہ اختلافات و نزاعات میں اضافہ ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں حل یہی رہ جاتا ہے، جسے حکمران گروہ اور اُن کے حامی دانشوروں نے اُچھالا بھی ہے کہ اسلامی سیکولرازم یا سیکولر اسلام ہونا چاہیے۔ شریعت کا سارا جھگڑا مٹ جاتا ہے۔ مگر کیا اختلافات اس حل کے بارے میں (باقی بر صفحہ آئندہ)

یہ فقرہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ ذہن میں "نفاذِ شریعت" کا نہ صرف یہ کہ تصور واضح نہیں ہے، بلکہ وہ "شریعت" اور اس کے نفاذ کے بارے میں شدید غلط فہمیوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ یہ غلط فہمیاں ایک ایسی ذہنیت کی پیداوار ہیں جس نے اس ملک میں چالیس سال سے نفاذِ شریعت جیسے اہم مسئلے کو معرضِ التوا میں ڈالا ہوا ہے۔

اِس ذہنیت کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک "شریعت" کا نفاذ عوام کی مرضی کے تابع ہے۔ اگر عوام چاہیں گے تو وہ نافذ ہوگی، ورنہ نافذ نہیں ہوگی۔ اِس طرزِ فکر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ایک عرصے سے "جمہوریت"، "جمہوری اقدار"، "جمہوری افکار" اور "جمہوری آزادیوں" کا وظیفہ سمجھے بُوجھے بغیر اتنی کثرت سے پڑھا ہے کہ "جمہوریت" بذاتِ خود "غیر مطلق" بن کر رہ گئی ہے، وہی ہمارے فکر و عمل کا آخری ہدف بنی ہوئی ہے، اُسی کے قیام اور بحالی کے لیے ہم نے تن من کی بازی لگا رکھی ہے، اُسی کو ہم نے ایسا مرکزِ نجات قرار دے رکھا ہے کہ گویا ہماری اجتماعی فلاح و بہبود کا ہر کام اسی "جمہوریت" سے حاصل ہوگا، اور جو بھلائی "جمہوریت" کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل ہو، وہ بھلائی کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہے۔

اسی ذہنیت کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک "اسلام" بھی وہی معتبر ہے جو جمہوری طریقوں سے یا جمہوری روایات کے تحت آئے۔ اس کے بغیر (معاذ اللہ) اسلام کی کوئی بات بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ اُلٹا طرزِ فکر باقی رہے گا، مُلک میں حقیقی اسلام کا نفاذ ہرگز نہیں ہو سکے گا، اس لیے کہ یہ طرزِ فکر "اسلام" اور "شریعت" کے بنیادی مفہوم ہی سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

بھی اتنے ہی شدید نہ ہوں گے۔

استدلال کی راہ پر تو آپ لوگ دو قدم بھی نہیں چل سکتے، بس جذبات نکتے چھانٹتے رہیے اور قوم کی تباہی کے عمل میں اپنا حصہ ادا کرتے جائیے۔ آخرت میں آپ کو بڑی جزا ملے گی۔

(ن۔ ص)

متضاد ہے۔ "اسلام" اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جانے کا نام ہے، اور اس کی "شریعت" کے واجب العمل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے، اور ایک بندے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ اُسے مان کر اس پر عمل کریں۔ خواہ عوام اُس سے خوش ہوں یا ناراض ہوں[1]۔ اتباعِ شریعت کا مقصد مخلوق کو نہیں، خالق کو راضی کرنا ہے۔ لہٰذا اس کے نفاذ کے پیچھے قوتِ حاکمہ عوام کی مرضی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ "اسلام" عوام کے پیچھے پیچھے چلنے اور اُن کی خواہشات کی پیروی کرنے کے لیے نہیں، ان کی قیادت و رہنمائی کرنے اور انہیں نفسانی خواہشات کی غلامی سے نکالنے کے لیے آیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔

"اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو آسمان و زمین میں فساد پھیل جائے"۔

"اسلام" تو ایسے ماحول میں آیا تھا کہ اس کے اردگرد عوام کی اکثریت شروع میں اُسے ناپسند کرتی تھی، اگر "عوام کی مرضی" ہی فیصلہ کُن ہوتی تو اسلام کو کبھی بھی نافذ ہونا نہیں چاہیے تھا۔ وہ تو ہمیشہ مخالفین کے نرغے میں پروان چڑھا ہے، اس نے لوگوں کے طعنے سہ کر اور ملامتیں سُن کر اپنی راہ بنائی ہے اور عوام کی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے اُن کی اصلاح کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا ہے، لہٰذا "اسلام" کو "عوام کی مرضی" اور "جمہوریت" کے تابع قرار دینا درحقیقت اسلام کے بنیادی تصور ہی سے متضاد ہے۔

پھر یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ عموماً "سب کے لیے قابلِ قبول" ہونے کے اس "نظریے" کی

---

[1] ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں بہ حیثیت داعیٔ اقامتِ شریعت ہماری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ عوام کو شریعت اور اس کے قانون و مقاصد کے بارے میں مطمئن کریں اور ان میں جذبۂ محبتِ شریعت پیدا کر کے ایک ایسا رضاکارانہ رجحانِ اطاعت اُبھاریں کہ وہ نہ خود مزاحم ہوں اور نہ اسلام دشمن طاقتیں اور منحرفینِ اسلام اُن کو آلۂ کار بنا کر فتنہ و فساد برپا کر سکیں۔ اس ذمہ داری کو پورا کیے بغیر اور اسے بالکل خارج از بحث قرار دے کر پُرامن طریقوں سے کام چلانا شاید ممکن نہ ہو (ادارہ)

ساری زد بیچاری "شریعت" ہی پر پڑتی ہے۔ یہ خیال ہمارے "جمہوریت پسند" حکام اور دانشوروں کو بہت کم آتا ہے کہ جو قوانین ہم پر چالیس سال سے مسلط چلے آرہے ہیں وہ کتنے افراد کے لیے "قابلِ قبول" ہیں؟ وہ کون سے عوام ہیں جنہوں نے ان قوانین کو سندِ منظوری عطا کی ہے؟ اور "سب کے لیے قابلِ قبول" کی یہ شرط ان قوانین پر کیوں لاگو نہیں ہوتی؟ — وہاں تو حال یہ ہے کہ ایک بدیسی اور غیر مسلم حاکم ہمارے سینوں پر بندوق رکھ کر یہ قوانین ہمارے سروں پر مسلط کر گیا۔ اور ہم ہیں کہ انہیں چالیس سال سے اپنے اوپر نہ صرف لادے چلے آرہے ہیں، بلکہ مسلمان عوام کی فریاد و فغاں کے باوجود اس بات پر مصر ہیں کہ یہ قوانین غیر محدود مدت تک عوام پر مسلط رہیں گے، "تا آنکہ ایسی" شریعت" وجود میں نہ آجائے جو "سب کے لیے قابلِ قبول ہو"۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اگر اسلام کو ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے ذاتی مفادات کو نقصان پہنچے گا، کسی کی آمدنی کم ہو جائے گی، کسی کے خرچ میں اضافہ ہو گا، کسی کی لیڈری جاتی رہے گی، کسی کے منصب پر حرف آئے گا، کسی کی بے مہار آزادی میں فرق پڑے گا، کسی کے عیش و تنعم میں کمی آئے گی، اور ایسے افراد جو ملکی و ملی مسائل کو اسی قسم کے مفادات کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں، وہ یقیناً ایسے احکام کے نفاذ کی مخالفت کریں گے، یا کم از کم انہیں ناگوار سمجھیں گے، جو ان کے ذاتی مفاد کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ اسی ملک میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جن کی تعداد کم ہے، لیکن اثر و رسوخ خاصا ہے۔ اور وہ نظریاتی طور پر اسلامی قانون کے بجائے لادینی طرزِ زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ اور نفاذِ اسلام کے ہر اقدام کی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے مخالفت کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اسلام کے ٹھیک ٹھیک نافذ ہونے سے کیسے خوش ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا "سب خوش رہیں" کی پالیسی کے ساتھ "شریعت" کا نفاذ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر شریعت پر عمل کرنا ہے، اور اللہ کے لیے کرنا ہے تو اس کے لیے کچھ حلقوں کی مخالفت مول لینی ہی پڑے گی، اگر ہم اس مخالفت کے لیے تیار نہیں ہیں تو نفاذِ شریعت کے کام سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔

تیسرے یہ "سب کے لیے قابلِ قبول" ہونے کی شرط تو ایسی ہے کہ اگر اس پر ٹھیٹھ معنی میں

عمل کیا جائے تو کسی جمہوری ملک میں کوئی سیکولر قانون بھی نافذ نہیں ہو سکتا، کوئی بڑے سے بڑا جمہوری ملک بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے تمام قوانین سے اس کے تمام باشندے مکمل طور پر مطمئن اور خوش ہیں، کیونکہ سب کو پوری طرح خوش رکھنے کا کوئی طلسماتی نسخہ اس ٹھیٹھ جمہوری حکومت کے پاس بھی نہیں ہے جسے "عوام کی حکومت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا ہے کہ اکثریت کی منظوری حاصل کر لی جائے، اور وہ اکثریت بھی قانونی اکثریت ہوتی ہے جس کا حقیقی اکثریت ہونا ضروری نہیں ہے۔

اب یہ منطق کس قدر عجیب ہوگی کہ دنیا کی ہر بات کو نافذ کرنے کے لیے تو اکثریت کا اتفاق کافی ہو، لیکن "شریعت" کے نفاذ کے لیے سب کا اتفاق ضروری قرار دیا جائے، جس کا حصول کم از کم اسباب و ظواہر کی اس دنیا میں عملاً ناممکن ہے۔

محترم وزیر اعظم نے جو بات کہی ہے کہ "ایسی شریعت" نافذ ہوگی جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو"۔ تو شاید اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ ہمارے ملک میں مختلف فرقے یا مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں، اور نفاذِ شریعت کے لیے ان سب کا اتفاق ضروری ہے۔

لیکن اس سلسلے میں بھی ہماری گذارش یہی ہے کہ اگر اسی اتفاق کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر جزوی قانون پر تمام مکاتبِ فکر کا اتفاق ضروری ہے تو ایسا اتفاق بھی بحالاتِ موجودہ ناممکن ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات کا جو شور مچا ہوا ہے، کم از کم قانونی مسائل میں یہ اختلافات اتنے زیادہ اور اتنے سنگین نہیں ہیں، تاہم بہت سے جزوی قوانین ایسے ہیں جن میں مختلف مکاتبِ فکر کے نظریات آپس میں متضاد ہیں، اور جزوی ان قوانین کی حد تک سب کا اتفاق حاصل نہیں ہو سکتا۔[1]

---

[1] آخر اب سے کچھ ہی عرصہ پہلے تک قانونِ شریعت نافذ رہا۔ جب کہ مختلف فرقے اور فقہی اختلافات بھی موجود تھے۔ کیا وجہ ہے کہ اب انکار کا یہ حیلہ نکال لیا گیا ہے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

کیا اس عدم اتفاق کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ شریعت کبھی نافذ نہ ہو، اور انگریزی قانون بدستور مسلط رہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، اور اس مسئلے کا حل معقولیت کے ساتھ تلاش کیا جائے تو اس کے دو ہی راستے عقلاً ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بالاتر اتھارٹی ایسی ہو جو ان مکاتبِ فکر کے نظریات میں حق و باطل کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور اس فیصلے کے مطابق جو نظریہ حق ہو، اُسے قانون بنا دیا جائے۔ لیکن اگر ایسی کوئی اتھارٹی موجود نہیں ہے تو رفعِ نزاع کا کوئی راستہ اس کے ممکن نہیں ہے کہ بنیادی طور پر شریعت کی اُس تعبیر کو اختیار کیا جائے جو ملک کے اکثریتی مکتبِ فکر کی تعبیر ہو۔ البتہ جو معاملات عبادات اور نکاح و طلاق اور وراثت سے متعلق ہیں، اُن میں ہر مسلم مکتبِ فکر کے لیے الگ قانون سازی کی جائے۔

چنانچہ ۱۹۵۱ء میں مُلک کے تمام مکاتبِ فکر کے سربرآوردہ علماء نے جمع ہو کر جو ۲۲ دستوری نکات مرتب کیے تھے، اس میں سب نے اِس اُصول پر اتفاق کیا تھا کہ ملک کا عام قانون ایک ہو گا، لیکن ہر مکتبِ فکر کے شخصی قوانین میں اسی مکتبِ فکر کی تشریح و تعبیر معتبر ہو گی اور یہی بات ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی طے کر دی گئی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا اس مسئلے کا حقیقت پسندانہ، منصفانہ اور قابلِ عمل حل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

یہ حل ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء میں علماء کے مشترک اجتماع میں بھی تجویز کیا گیا تھا، اس کے بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کہ یہاں چونکہ مختلف فرقے ہیں اور فقہیوں کا اختلاف ہے، لہٰذا نفاذِ شریعت ممکن ہی نہیں۔ سیدھی طرح کیوں نہیں مانتے کہ اب سُپر پاورز نہیں مانتیں اور جاگیردار اور سرمایہ اور بیوروکریٹس اور دُنیا پرستوں کی خاندانی جتھا بندیاں اور لادینیت پسند سیاسی جماعتیں راضی نہیں، نیز قادیانی اور عیسائی اور اسماعیلی اور کمیونسٹ مخالف ہیں۔ مسلم عوام کی اکثریت کی تو پرواہی نہیں، کیونکہ ان کا تو آزادی اور شہریت کا مرتبہ اور انسانی حقوق حتیٰ کہ ضمیر کے مطابق شعور سے رائے دہی کا موقع وغیرہ وہ ساری نعمتیں نہیں ملیں جو خود لادین جمہوریت بھی دیتی ہے۔ (ن - ر - م)

۱۹۷۳ء کے دستور میں اسے باقاعدہ آئینی حیثیت بھی دی گئی۔ جس کے بعد فرقہ وارانہ اختلافات کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے ہو جانا چاہیے۔ اور اب از سرِ نو اس مسئلہ کو اُٹھانا، ایک طے شدہ بات کو بلا وجہ پیچیدہ بنانے کے مترادف ہے۔

آخر میں ہم محترم وزیرِ اعظم کی خدمت میں یہ دردمندانہ گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ اس ملک کی حیات و بقا کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی جسم کے زندہ رہنے کے لیے اُس میں رُوح کا وجود ضروری ہوتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں، اور ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرض عاید ہے کہ ہم اس کے احکام کو اس کی سرزمین پر نافذ کریں، اس لیے بھی ضروری ہے کہ پاکستان کا مقصدِ وجود ہی یہ تھا کہ اس خطے میں مسلمان اپنے دین کو عملاً برپا کریں۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ حکومت کی وجہِ جواز اسلام کے نفاذ کے سوا کچھ اور نہیں، اور وہ انہی وعدوں کے ساتھ برسرِ اقتدار آئی ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے زمانے میں نفاذِ اسلام کا فریضہ انجام دے گی۔

لہٰذا موجودہ حکومت پر پچھلی تمام حکومتوں سے زیادہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا یہ فریضہ اخلاص اور تن دہی کے ساتھ انجام دیں۔ اقتدار نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ سایہ کسی بھی وقت ڈھل سکتا ہے۔ لیکن اقتدار کے سائے میں انجام دیئے ہوئے اچھے برے کام صرف تاریخ ہی میں محفوظ نہیں ہوتے، بلکہ اس جہان میں بھی ریکارڈ ہو جاتے ہیں جہاں ہر انسان کو اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے۔

خدا کرے کہ اس حقیقتِ عظمیٰ کے استحضار کے ساتھ ہم سب کے دل میں مخلوق کے بجائے اپنے خالق کو راضی کرنے اور اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر پیدا ہو جائے تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَارِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔ آمین